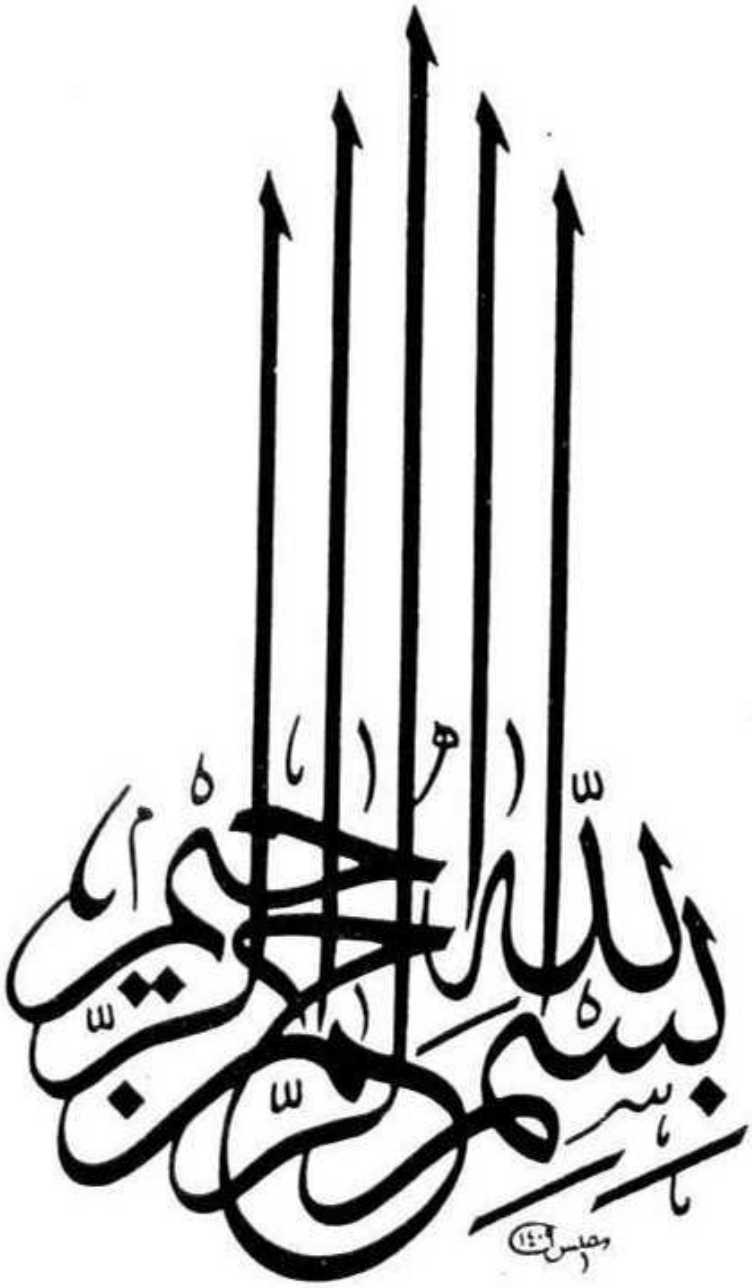
بسم الله الرحمن الرحيم

# مثبت اور منفی سوچ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ○ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَ سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○

## زندگی گزارنے کے دو انداز:

کائنات میں موجود ہر چیز کو دیکھنے اور اس کے متعلق سوچنے کے دو انداز ہوتے ہیں' ایک مثبت انداز اور ایک منفی انداز۔ اسی بنیاد پر زندگی گزارنے کے بھی دو انداز ہیں مثبت انداز زندگی اور منفی انداز زندگی۔ ہر انسان کے اندر مثبت سوچ بھی موجود ہوتی ہے اور منفی سوچ بھی۔ زندگی کے معاملات میں کوئی انسان اپنی مثبت سوچ کے ذریعہ معاملات کے مثبت پہلو پر نگاہ رکھتا ہے اور کوئی اپنی منفی سوچ کے باعث منفی پہلو پر نگاہ رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو انسان مثبت سوچ رکھنے والا ہوتا ہے وہ مثبت فیصلہ کرکے اچھے اور بہتر نتائج اخذ کرلیتا ہے اور منفی زاویہ سے دیکھنے والا منفی فیصلہ کرکے نقصان اٹھاتا ہے۔ ایک انگلش رائٹر کا مقولہ ہے:

*The life is ten percent how to make it,*

*and ninty percent how to take it.*

یعنی دس فیصد آپ کی وہ زندگی ہے جسے آپ اپنی محنت اور ہاتھ سے بناتے ہیں اور نوے فیصد زندگی وہ ہے جسے آپ اپنے ماحول اور معاشرے سے قبول کرتے ہیں۔ اب انسان ماحول سے نوے فیصد زندگی کس انداز سے قبول کرتا ہے؟ یہ اس کی اپنی سوچ پر منحصر ہے۔ چاہے تو مثبت سوچ کے ذریعہ زندگی میں پیش آنے والے معاملات کے مثبت پہلو

پر نگاہ رکھے اور فائدہ حاصل کرلے چاہے منفی پہلو پر نگاہ رکھ کر غلط نتائج اخذ کرلے۔

**ایک اشکال کا جواب:** اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ مثبت سوچ کا پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے اور منفی سوچ کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے تو پھر انسان کا کیا قصور؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شخص اپنی کم علمی کے باعث نظام کائنات کے فطرتی اصول اور قاعدہ سے ناواقف ہے۔ ایسا شخص گویا یہ اعتراض کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کو پیدا کیا' دن کا تو فائدہ ہے کہ اس میں کام کاج ہوتے ہیں رات کو بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ سونے میں انسان کی آدھی زندگی ضائع ہو جاتی ہے۔ نہ رات بنائی جاتی اور نہ ہی انسان کی زندگی ضائع ہوتی۔ ایسا شخص گویا یہ اعتراض کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھری کے اندر پھل کاٹنے کی صلاحیت رکھی ہے' اس کا تو فائدہ ہے لیکن انسانوں کی گردن کاٹنے کی صلاحیت کیوں رکھی گئی؟ نہ ہی یہ صلاحیت رکھی جاتی اور نہ ہی قتل کا جرم ہوتا۔

اس ضمن میں عربی کا ایک مقولہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا ہر چیز اپنی ضد (مخالف چیز) سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً دن کی پہچان رات کی وجہ سے ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو' صرف دن ہی دن ہوتا تو کون کہتا کہ دن ہو گیا ہے۔ محبت کی پہچان نفرت کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح ایمان کی پہچان کفر کے باعث ہے۔ اگر کفر کا وجود ہی نہ ہوتا سب ہی ایمان والے نیک اور صالح ہوتے تو پھر انبیاءؑ کی بعثت کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ انبیاءؑ کی ضد شیطان ہے۔ گویا کہ ایمان اور غلبہ اسلام کے محرک اور محافظ انبیاءؑ ہیں اور کفر کا محرک اور محافظ شیطان ہے۔ اللہ رب العزت خود فرماتے ہیں کہ "میں نے ہر چیز کا جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر چیز کا جوڑا جوڑا ہونا نظام کائنات کا بنیادی اصول ہے۔

**جدید سائنس کی بنیاد:** آج سائنس کی دنیا اسی اصول پر تحقیقات کر رہی ہے۔ یہ اصول گویا جدید سائنس کی بنیاد نظر آتا ہے۔ کمپیوٹر جو موجودہ دور کی جدید ترین اور مفید ترین ایجاد ہے اس کا سارا Function (عمل) دو Bits پر ہے۔ صفر (0) اور ایک (1) پر۔ یہ زیرو اور ایک' یہ بھی ایک جوڑا ہے۔ بلکہ آج

کے سائنس دان صدیوں کی تحقیقات اور ہزاروں تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ Matter (مادہ) ایک چیز ہے تو اس کا بھی کوئی جوڑا ہونا چاہیے۔ اور اس جوڑے کو انہوں نے Anti-matter کا نام دیا ہے۔ اب وہ اس anti-matter کی دریافت کیلئے محنت کر رہے ہیں۔

**روح کی فوقیت مادے پر:** اب دیکھتے ہیں کہ روح کے مقابلے میں مادہ کی کیا حیثیت ہے؟ مادہ کا خمیر خاک سے ہے اور روح کا خمیر افلاک سے بھی اوپر عالم ارواح سے ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں' وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی)۔ مادہ کا کوئی نہ کوئی مقام ہوتا ہے مگر روح لامکانی شے ہے۔ مادہ کسی چیز سے ٹکرا کر رک جاتا ہے مگر روح آسمان سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ مادہ کو بلندی کی طرف پھینکیں تو Gravity (کشش ثقل) کے باعث پستی کی طرف لوٹتا ہے مگر روح عرش الٰہی کی طرف پرواز کر جاتی ہے تو کئی ہزار سال کی بلندیوں اور رفعتوں کو طے کر جاتی ہے۔ مادیت کے شہسواروں کی معراج یہ ہے کہ وہ صدیوں کی کاوشوں اور محنتوں کے بعد چاند' مشتری اور ثریا تک بمشکل پہنچ سکے ہیں لیکن روحانیت کے شہسوار اعظم سید البشر ﷺ کی معراج یہ ہے کہ آپ ﷺ رب ذوالجلال کے اتنا قریب پہنچے جیسے تیر کمان کے نزدیک ہوتا ہے۔ اور کہکشاں اور ثریا تو نبی ﷺ کی قدمین شریفین کی گرد راہ ہے۔

نازاں جس پہ حسن ہے وہ حسن رسول ہے
یہ کہکشاں تو آپ کے قدموں کی دھول ہے

مادیت تو یہ ہے کہ انسان کھربوں ڈالر لگا کر چاند پر پہنچا اور روحانیت یہ ہے کہ محبوب خدا ﷺ کی انگشت مبارک کے اشارہ سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ مادی دنیا کے پوپ کہتے ہیں کہ Water maintain its surface (پانی اپنی سطح برقرار رکھتا ہے) لیکن میدان روحانیت میں عصائے موسوی کی ایک ضرب سے طغیانی لہریں اور طوفانی موجیں سمٹ کر بارہ راستے بنا دیتی ہیں۔

**سوچنے کے دو انداز:** بات ہو رہی تھی کہ سوچ کے زاویے دو ہی ہیں۔ مثبت سوچ دل میں فرحت اور خوشی پیدا کرتی ہے اور منفی سوچ تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ مثال کے طور پر دو شاعر باغ میں گئے' ان میں سے ایک خوش تھا اور دوسرا غمگین۔ دونوں کی نگاہ ایک کھلے ہوئے پھول پر پڑی۔ شعراء حضرات بڑی حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور Nature (فطرت) کو Study (مطالعہ) کرتے رہتے ہیں۔ دونوں نے پھول کے متعلق اپنے اپنے تاثرات بیان کئے۔ جو غمگین تھا اس نے کھلا ہوا پھول دیکھ کر کہا کہ اس مظلوم لالہ کو بھی کسی نے زخمی کر دیا ہے۔ دیکھئے! اس کا بھی میری طرح سینہ چاک ہے۔ بقول شخصے:

آ ملے ہیں سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

دوسرا شاعر کہنے لگا کہ یہ پھول بھی میری طرح خوش ہے اور ہنس رہا ہے' دیکھئے کیسے کھلا ہوا ہے۔ بقول شخصے:

یہ سن کر کلی نے تبسم کیا

غور کیجئے! پھول ایک ہی ہے لیکن دونوں کی سوچ کا زاویہ مختلف ہونے کے باعث تاثرات مختلف ہیں۔

ایک جیل میں سے دو قیدیوں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایک کی نظر کیچڑ پر پڑی اور دوسرے کی نظر پھول پر پڑی۔ جس کی نگاہ کے سامنے کیچڑ تھا اس نے کہا کہ باہر تو ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ اور جس کی نگاہ کے سامنے پھول تھے اس نے کہا کہ جیل کے باہر تو ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔ ارے! لوگ شاکی ہیں کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں اور میں شاکر ہوں کہ کانٹوں کے ساتھ پھول بھی ہیں۔

میز پر آدھا گلاس پانی پڑا تھا۔ دو آدمیوں نے اسے دیکھا۔ ایک نے کہا کہ گلاس آدھا خالی ہے۔ دوسرے نے کہا' الحمد للہ آدھا بھرا ہوا ہے۔ ثابت ہوا کہ سوچنے کے انداز دو ہی ہیں۔ مثبت انداز پریشانیوں کو آسان کر دیتا ہے اور منفی انداز پریشانیوں کو اور مشکل بنا دیتا ہے۔ اس وجہ سے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ مثبت سوچ رکھنے والے

لوگ حالات کو لے کر چلتے ہیں اور منفی سوچ والے حضرات کو حالات لے کر چلتے ہیں۔ وہ کٹھ پتلی بن کر زندگی گزارتے ہیں۔

*Some people drive the situation and*

*some are driven by situation.*

(کچھ لوگ حالات کو لے کر چلتے ہیں اور کچھ لوگوں کو حالات لے کر چلتے ہیں)

**اختلاف رائے:** انسانوں میں کئی دفعہ اختلاف رائے بھی ہوجاتا ہے۔ ہم لوگ اختلاف رائے کو دشمنی بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ قدرت نے ہر آدمی میں مختلف دماغ رکھا ہے' ہر ایک کی سوچ کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے انداز سے ہی سوچتا اور بات کرتا ہے۔ اس لئے اختلاف رائے ایک فطری چیز ہے نہ صرف یہی بلکہ اختلاف رائے ایک نعمت بھی ہے۔ جب اختلاف رائے ہوگا تو معاملہ کے کئی پہلو سامنے آئیں گے اور ان میں سے بہترین حل کا انتخاب آسانی سے کرلیا جائے گا۔ مشورہ کرنا ایک مستقل سنت نبوی ﷺ ہے اور اس کی روح ہے ہی اختلاف رائے۔ مشورہ کرنے میں زیادہ ذہن جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ذہن ایک الگ زاویہ سے معاملہ فہمی کرکے مشورہ دیتا ہے۔ اس طرح معاملہ کے خفیہ پہلو بھی منظر عام پر آجاتے ہیں۔ پلاننگ میں اس پہلو کو Alternatives (متبادل صورتیں) کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انجینئرز اور منیجرز جب کسی مسئلہ کے حل کیلئے مشورہ کرنے بیٹھتے ہیں تو وہ مسئلہ کی نوعیت اور متعلقہ حالات کو مدنظر رکھ کر مشورہ کرتے ہیں۔ اب جتنے زیادہ ذہن اکٹھے ہوتے ہیں اتنے زیادہ حل اور متبادل صورتیں زیر غور آتی ہیں۔ مثال کے طور پر دس آدمی مشورہ کرتے ہیں ان سب کی رائے مختلف ہوتی ہے۔ ان میں تین چار بہتر صورتوں کا انتخاب کرلیا جاتا ہے۔ بعد میں ان تین چار صورتوں کا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپس میں موازنہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ان میں سے بہترین صورت کا انتخاب کرلیا جاتا ہے۔ جس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بہرحال اختلاف رائے فائدہ کی چیز ہے۔

**اختلاف رائے کی مثالیں:** ایک بھائی کہتا ہے کہ مکان ابھی تعمیر کرنا ہے۔ دوسرا

کہتا ہے کہ دو ماہ ٹھہر کر تعمیر کریں گے۔ یہ اختلاف رائے ہے لیکن اس کو دشمنی بنالینا بیوقوفی ہے کیونکہ سوچ میں فرق ہونے کی وجہ سے دونوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ایک نے اپنی سوچ کے زاویے سے دیکھا تو اسے مکان کی تعمیر کرنا آسان نظر آیا اور دوسرے نے اپنی سوچ کے زاویہ سے دیکھا تو اس کو مشکل لگا۔

بیوی ایک جگہ بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتی ہے' خاوند دوسری جگہ اپنے رشتہ داروں میں کرنا چاہتا ہے تو اس وجہ سے عام طور پر میاں بیوی میں بات بڑھ جاتی ہے جو کہ گھر کی ناچاقی کا باعث بنتی ہے حالانکہ یہ صرف اختلاف رائے ہے۔ اگر وہ مثبت سوچ کے ساتھ افہام و تفہیم سے کام لیں تو مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے اور دونوں میں سے جس کی رائے بہتر ہو اس کے مطابق فیصلہ کرلیا جائے۔

## بہترین اصول زندگی:

میاں بیوی میں بعض معاملات میں اختلاف رائے ہو کر بحث و تکرار کی نوبت تو آ ہی جاتی ہے۔ اگر اس دوران فریقین حقیقت پسندی سے کام لیں اور ایمانداری سے ذرا یہ غور کرلیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے۔ ظاہر ہے دونوں میں سے حق پر تو ایک ہی ہے' دونوں تو نہیں ہو سکتے۔ تو جو حق پر نہیں ہے وہ ہمت کر کے خاموشی اختیار کرلے اور دوسرے فریق کی کڑوی کسیلی سنتا رہے' صبرو ضبط سے کام لے اور جواب ہرگز نہ دے۔ اس طرح وہ دوسری طرف صبرو تحمل دیکھ کر جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا بلکہ مثبت اثر لے گا اور بحث و تکرار بڑھنے کی نوبت نہیں آئے گی اور تھوڑے وقت کے بعد پھر دونوں شیر و شکر ہو جائیں گے۔ تو میاں بیوی کو شروع سے ہی ذہن بنالینا چاہیئے کہ جب کبھی ایسی نوبت آئے تو دونوں غور کرلیا کریں گے کہ حق پر کون ہے۔

## ساس بہو کے جھگڑوں کا بہترین حل:

زوجین کے درمیان جھگڑے عموما ساس بہو سے ہی جنم لیتے ہیں۔ اور ایسے جھگڑوں کا ایک بہترین حل ہے۔ اگر وہ طریقہ اختیار کرلیا جائے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ساس بہو کی بنیاد پر جھگڑے کھڑے ہوں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی شروع ہی سے یہ

Compromise( سمجھوتہ) کرلیں کہ میاں اپنی بیوی کے والدین کی خدمت کرے اور ضروریات کا خیال رکھے اور بیوی اپنے خاوند کے والدین کی خدمت کرے اور ضروریات پوری کرنے کیلئے تیار رہے۔ یعنی دونوں اپنے اپنے سسرال کی خدمت اور معاونت کیلئے عملی طور پر تیار رہیں۔ ویسے بھی حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ شادی سے پہلے ایک والد اور ایک والدہ اور شادی کے بعد دو والد اور دو والدہ ہوتی ہیں۔ یعنی ساس سسر کے حقوق اپنے ہی والدین کی طرح ہیں۔

**ذاتی واقعہ:** میرے پاس ایک خاتون آئی جو کافی پڑھی لکھی لگتی تھی۔ شاید ایم۔اے کیا ہوا تھا۔ اس نے پردہ کے پیچھے بیٹھ کر بات کی۔ اپنی ساس کے بڑے گلے شکوے کیے کہ ناک میں دم کر رکھا ہے' بات بات پر نوک جھونک کرتی ہے۔ غرض اس نے ساس کا خوب رونا رویا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ساس کے شکوے کرتی رہی۔ اور اس دوران وہ رو پڑی۔ لیکن ساتھ ہی بتایا کہ خاوند میرے ساتھ بہت اچھا ہے' بہت پیار سلوک رکھنے والا ہے۔ اس کے خاوند کی ایک فیکٹری ہے' بڑا کھاتا پیتا گھرانہ ہے' کار کوٹھی اس کے پاس ہے لیکن ساس کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ جب اس نے بتایا کہ خاوند اس کے ساتھ بہت اچھا ہے' اس سے اسے کوئی شکوہ نہیں تو میں نے اس سے ایک سوال کیا' کیا آپ کو خاوند اور گھر اچھا لگا؟ کہنے لگی' جی ہاں۔ میں نے پوچھا کہ آپ اس گھر میں کیسے آئیں؟ کہنے لگی' وہ تو میری ساس میرے گھر آئی' مجھے دیکھا اور پسند کیا' اور مجھے بیاہ کر لے آئی۔ اس پر میں نے کہا کہ اس نے تو آپ پر احسان کیا کہ اتنے اچھے گھر میں آپ کو لے آئی جس میں آپ کو خاوند بھی اچھا ملا۔ اس بڑے احسان پر تو آپ کو عمر بھر اپنی ساس کا شکر گزار رہنا چاہیے تھا' لیکن یہ شکوے کیسے؟ میں نے کہا اب بتائیں کہ اتنے بڑے احسان کے مقابلہ میں تمہاری یہ باتیں کیسی ہیں؟ کہنے لگی' آپ نے تو میرا مسئلہ حل کردیا۔ اس احسان کے مقابلے میں تو یہ باتیں واقعی کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتیں۔

**ایک انجینئر اور اس کے بیٹے کی سوچ:** سوچ کا زاویہ ہر ایک کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ ایک انجینئر صاحب ہیں ان کا ایک

ہی بیٹا تھا۔ ایک دن وہ گھر پر ڈرائنگ بنا رہے تھے۔ ان کا چھوٹا سا بیٹا ساتھ بیٹھا تھا اور چیزوں کو آگے پیچھے کر رہا تھا جس سے ان کے کام میں رکاوٹ آ رہی تھی۔ انہوں نے بیٹے کو الگ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ضد کر گیا۔ انجینئر صاحب رحمدل آدمی تھے. وہ بیٹے کو مار کر یا سختی سے دور بھی نہیں کر. چاہتے تھے۔ بیٹے کو مصروف کرنے کی ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی۔ ان کے پاس اخبار کا ایک صفحہ پڑا تھا جس پر دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اخبار کے کئی ٹکڑے کر دیئے اور ٹکڑے اپنے بچے کو دیئے کہ اگر اس نقشہ کو ٹھیک طرح سے جوڑ لے تو میں دس روپے کا نوٹ انعام میں دوں گا۔ اب اپنی طرف سے انجینئر صاحب نے بڑا پکا انتظام کر دیا تھا کہ میرا بیٹا دو تین گھنٹوں تک مصروف رہے گا۔ بیٹا بہت خوش ہوا کہ دس روپے کا نوٹ انعام میں ملے گا۔ وہ اخبار کے ٹکڑے لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جبکہ انجینئر صاحب مطمئن ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ بیٹا تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ نقشہ بالکل ٹھیک جوڑ کر آ گیا۔ باپ بہت حیران ہوا کہ اس نقشے کا جوڑنا تو بہت ہی مشکل تھا' بیٹے نے کیسے جوڑا؟ بیٹا مسکرایا اور اخبار کو الٹ دیا۔ دوسری طرف ایک عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بچے نے اس تصویر کو دیکھ کر ٹکڑے ترتیب سے جوڑ دیئے تو نقشہ خود بخود بن گیا۔ سوچئے کہ باپ اس کام کو ایک زاویے سے دیکھ رہا تھا تو وہ کام مشکل لگ رہا تھا لیکن بیٹے نے دوسرے زاویے سے دیکھا تو مشکل کام بالکل آسان ہو گیا۔

**قراء حضرات کیلئے چند اصلاحی مشورے:** ایک انجینئر صاحب نے تو یوں حکمت عملی کے ساتھ بچے کو متبادل کام پر لگا دیا اور بچے پر سختی نہ کی مگر ہمارے ہاں قاری صاحبان تو بچوں کو بہت مارتے ہیں۔ یہ بچوں پر ظلم کرتے ہیں' روز محشر ان سے پوچھ ہو گی۔ مارنے والے ظالم ہیں اور جن کو مارا جا رہا ہے وہ مظلوم ہیں۔ قیامت کے دن دونوں ظالم اور مظلوم بن کر پیش کئے جائیں گے۔ شریعت میں اس طرح مارنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ ہم نے بڑے بڑے علماء اور مفتی حضرات سے اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے۔ البتہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر بچے کو سزا دینا ضروری بھی ہو تو اوسط درجہ کے تین تھپڑ لگائے جا سکتے ہیں' تین سے زیادہ نہیں اور وہ بھی،

چہرہ کے علاوہ کسی اور جگہ پر کیونکہ چہرہ پر مارنے کی ممانعت آئی ہے لیکن ہمارے ہاں تو بچہ تھوڑا سا بھول جائے تو ڈنڈا دے ماریں گے۔ نہیں دیکھتے کہ سر پر لگ رہا ہے' ناک پر لگ رہا ہے یا کہاں لگ رہا ہے۔ ارے اللہ کے بندے! وہ بچہ ہے' تم نہیں بھولتے؟ اگر اسی قاری صاحب سے وہی پارہ سنا جائے تو دس دفعہ بھولیں گے۔ اور بچے نے تو بھولنا ہی ہوتا ہے۔ اس نے کونسی چوری کرلی ہے یا کوئی اور جرم کرلیا ہے جو اس قدر سزا دی جاتی ہے۔ اس طرح تو بچے سنورنے کی بجائے الٹا بگڑ جاتے ہیں اور دین اور مدارس سے باغی ہو جاتے ہیں۔ قاری صاحب تو سمجھتے ہیں کہ وہ اچھا کر رہے ہیں اور ثواب کا کام ہے لیکن یہ گناہ ہے جس کا جواب آخرت میں دینا پڑے گا۔ دراصل جو لوگ بچوں کو مارتے ہیں عموماً اپنے نفس کی وجہ سے مارتے ہیں اور گویا اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے مارتے ہیں کہ ہم اس بچے کو سمجھانے سے عاجز ہیں' اس کو اچھے طریقہ سے سمجھانے سے قاصر ہیں مگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ شریعت اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتی کہ بچے کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دی جائیں۔

میرے دوستو! بچوں کو تعلیم میں چلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو وقتاً فوقتاً ترغیب دے کر محنت کا شوق دلایا جائے۔ بچے معصوم دل ہوتے ہیں۔ اچھی اچھی باتوں کا اثر بہت جلدی قبول کر لیتے ہیں اور ذوق شوق سے محنت کرنے لگتے ہیں۔ یہ ذہن سازی ہے اور بچوں کی ذہن سازی کرنا مستقل ایک کام ہے۔ اس سے بچوں کی شروع ہی سے ذہنی نشوونما ہونے لگتی ہے اور بڑے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن بات بات پر بچوں کو ڈانٹنا اور ہر معمولی غلطی پر سزا دینا منفی رویہ ہے۔ اس طرح بچہ ڈانٹ ڈپٹ اور مار سہنے کا آہستہ آہستہ عادی ہو جاتا ہے اور پڑھائی سے دل چرانے لگتا ہے کیونکہ وہ یہی سمجھتا ہے کہ استاد کی ڈانٹ اور مار کٹائی ایک لازمی چیز ہے۔

اس منفی رویہ کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچوں کے دل میں استاد کی عقیدت اور ادب نہیں رہتا بلکہ استاد سے بغض' نفرت اور وحشت جنم لیتی ہے۔ اور یہی چیزیں آہستہ آہستہ پختہ ہو کر اس کو مستقل باغی بنا دیتی ہیں اور وہ جوان ہو کر بھی مسجد' مدرسہ اور مولوی سے متنفر رہتا ہے اور اعمال صالحہ سے خالی ہی دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اب

دیکھئے، کتنی بڑی خرابی پیدا ہوئی اور ان خرابیوں کے ذمہ دار مسجد کے قاری صاحب اور مدرسے کے استاد ہیں۔ جہاں تک بھولنے کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری چیز ہے۔ کیا انبیاء علیہم السلام سے سہو سرزد نہیں ہوئیں؟ حالانکہ انبیاءؑ پر تو جاکر انسانیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ بھول اور لغزش تو آدم کے خمیر میں رکھ دی گئی ہے جو ایک مفید چیز ہے بشرطیکہ اصلاح مناسب طریقہ سے کر دی جائے۔

بھول اور لغزش پر یہی مثبت سوچ ہے اور بھول پر لال پیلا ہو کر سزا دینا منفی سوچ ہے۔ اگر سزا دینا ضروری ہی ہو تو درد اور چوٹ والی سزا دینے کی بجائے ایسی سزا دی جائے جو تھکا دینے والی ہو مثلاً دیر تک کھڑا رکھنا، دونوں ہاتھ اوپر کروادینا، ایک پاؤں اوپر کروادینا، دونوں ہاتھوں میں معمولی وزن پکڑا کر دونوں بازوؤں کو متوازی کر دینا وغیرہ۔ اور ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ غلطی پر سزا دینے کی بجائے اچھا سبق سنانے والوں کو انعام دیا جائے تاکہ دوسرے بچے بھی ذوق و شوق کے ساتھ سبق یاد کریں۔

ایک اور بات بھی ضمناً عرض کر دوں کہ بعض مدارس میں اساتذہ اپنے طلبا سے بات کرتے وقت بڑی بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں۔ بعض بچوں کو خواہ مخواہ ہی شیطان، خبیث، خنزیر، بدمعاش جیسے ناموں سے پکارتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ برے ناموں سے بلاتے ہیں۔ اور بعض کو ان کے اصل ناموں کو بگاڑ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ان کے منصب اور مرتبہ کے اعتبار سے یہ بات بالکل مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی اللہ رب العزت کا ارشاد ہے وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابْ ایک دوسرے کو برے نام مت دو۔ لہٰذا ان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جن بچوں کو آج ہم اس طرح تربیت دے رہے ہیں آخر آگے جاکر جب یہی بچے استاد بنیں گے اور پھر اپنے شاگردوں سے بات کرتے وقت یہی منفی رویہ اپنائیں گے تو اس کا گناہ کس کو ہوگا؟ خدارا! اللہ کے مہمانوں سے یہ سلوک کرکے اپنی آخرت خراب نہ کیجئے۔

## سوچ کا اثر عملی زندگی پر:

دنیا کی یونیورسٹیوں کا یہ جاننے کیلئے سروے کیا گیا کہ امتحانوں میں فرسٹ آنے والے طالب علم کس ذہن کے

مالک ہوتے ہیں۔ کئی طرح سے Analyze (تجزیہ) کیا گیا اور مختلف وجوہات پر غور کیا گیا تو ایک بات سب میں Common (مشترک) نکلی کہ فرسٹ آنے والے طلباء مثبت سوچ کے حامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں Confidence (اطمینان) بھی زیادہ تھا۔

حقیقت یہی ہے کہ اگر سوچ Positive (مثبت) ہو تو انسان کے اندر کا سسٹم بھی ٹھیک کام کرتا ہے کیونکہ انسان کی سوچ Internal system (اندرونی نظام) کو کنٹرول کرتی ہے۔ اگر انسان کی سوچ Negative (منفی) ہو جائے تو اندر کا سسٹم بھی غلط چلتا ہے کیونکہ انسانی دماغ بدن میں Head Controller کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی دماغ بڑے پیچیدہ Nervous system (نظام عصبی) کے ذریعے جسم کے تمام نظاموں کو کنٹرول کرتا ہے اور وہ سارا نظام نہایت ہی حساس اور متاثر ہونے والا ہوتا ہے۔ جس کے باعث سوچ کا مثبت یا منفی رخ بہت ہی آسانی سے InternalSystem (اندرونی نظام) کو متاثر کرتا ہے۔ صرف سوچ کے بدلنے سے اندر کا سسٹم بالکل بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کمرے سے بلی کو بھگانا ہو اور دروازہ کھلا ہو تو وہ آسانی سے بھاگ جائے گی اور اگر دروازہ بند کر کے اسے مارنے کی کوشش کریں گے تو وہ گلے پڑ جائے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی سوچ حالات کے مطابق بدل گئی۔ نئی صورت حال سے نمٹنے کیلئے اس نے اپنے آپ کو تیار کر لیا اور لڑنے کیلئے کمربستہ ہو گئی۔ وہی بلی جو معمولی حرکت یا آواز کے ڈر سے بھاگ جاتی' صرف سوچ بدل جانے سے اپنے سے سینکڑوں گنا قوی انسان سے مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو گئی۔

آج طلبا امتحان کیلئے کیوں تیار نہیں ہوتے؟ حالانکہ وقت ہوتا ہے' صحت ہے' ذہانت ہے لیکن پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں دل نہیں چاہتا؟ اس لئے کہ سوچ منفی ہو گئی ہے۔ جس کے باعث ذہنی طور پر تیار نہیں ہو سکتے۔ اس طرح اندر کا سسٹم ڈاؤن ہونے سے انسان کے اندر Will Power (قوت ارادی) نہیں رہتی۔ یہ چیز اللہ کو ناپسند ہے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ بلند ہمتی کو پسند فرماتے ہیں اور بلند ہمت لوگ ہی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ اللہ کی مدد شامل ہوتی ہے۔

*God helps those who help themselves*

(خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں)

اس سے ثابت ہوا کہ عملی زندگی میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کیلئے اور اپنے اچھے مقاصد کے حصول کیلئے انسان کے اندر خود اعتمادی اور مضبوط قوت ارادی کا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ اور ان اعلیٰ صفات کے حصول کیلئے آدمی کی سوچ کا مثبت ہونا ضروری ہے کیونکہ منفی سوچ کے ساتھ ان صفات کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔

**ایک باکسر (Boxer) کی مثال:** مائیک ٹائی سن دنیا کا بڑا باکسر تھا۔ کسی مقدمہ میں ملوث ہونے کی وجہ سے جیل میں بند رہا۔ جیل میں اسے باقاعدہ Practice (ورزش) کرنے کا موقع نہ ملا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی درجہ میں وہ پریکٹس کرتا رہا اور اپنے آپ کو فٹ رکھا۔ اسی دوران اس نے اسلام قبول کرلیا تو اسکا نیا نام عبدالعزیز رکھا گیا۔ جب وہ جیل سے باہر آیا تو اسے چمپئن باکسر نے چیلنج کیا۔ اس نے قبول کرلیا۔ مقابلہ سے پہلے دونوں کا انٹرویو اخبار میں شائع ہوا۔ اس عاجز نے بیرون ملک میں ان کا انٹرویو خود پڑھا ہے۔ مخالف باکسر نے لمبا چوڑا انٹرویو دیا کہ میں اس کی ناک توڑ دوں گا' بازو توڑ دوں گا اور اتنا ماروں گا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ اور جب انہوں نے مائیک ٹائی سن (عبدالعزیز) سے انٹرویو لیا تو اس نے ایک ہی بات کہی کہ "یہ تو پپو ہے"۔ بس اس نے ایک ہی جواب دیا اور اپنے ذہن کو Tension (تناؤ) سے فارغ رکھا اور ایسے ہی ہوا کہ ٹائی سن نے اپنے حریف کو دو تین منٹ میں شکست دے دی۔

**حضرت داؤدؑ کا ایک دلچسپ واقعہ:** بائبل میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ قرآن پاک میں بھی اسکا مختصر ذکر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت طالوت علیہ السلام وقت کے بادشاہ جالوت کے مقابلے کیلئے گئے۔ جالوت بڑا لحیم و شحیم' جسیم اور طاقتور تھا۔ اس کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ دیکھنے سے ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ طالوتؑ ضعیف العمر تھے اور حضرت داؤدؑ جوان العمر تھے اور ماشاء اللہ اٹھتی جوانی تھی۔ جب دونوں حضرات نے جالوت کو دیکھا تو حضرت طالوت علیہ السلام

نے فرمایا:

*It is very dificult to kill him because he is very big.*

(اسے مارنا تو بہت مشکل ہے کیونکہ یہ تو بہت بڑا ہے)

ادھر حضرت داؤد علیہ السلام فرمانے لگے

*It is very easy to kill him because he is very big,*

*I never miss him.*

(اسے مارنا تو بہت آسان ہے کیونکہ یہ تو بہت بڑا ہے۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہ ہو گا)

اور ایسے ہی ہوا کہ حضرت داؤدؑ نے پتھر جالوت کی پیشانی پر مارا اور ختم کر دیا۔ تو جو بھی آدمی مضبوط قوت ارادی سے کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔

## خیر خواہی مثبت سوچ میں ہے:

آدمی کی سوچ مثبت ہونی چاہیئے۔ مثبت سوچ سے اپنا بھی فائدہ ہوتا ہے اور دوسروں کا بھی کیونکہ خیر خواہی مثبت سوچ میں پوشیدہ ہے۔ اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ (دین سراسر خیر خواہی ہے) مومن اپنا بھی خیر خواہ ہوتا ہے اور دوسروں کا بھی خیر خواہ ہوتا ہے۔ ایمان کی یہ لازمی شرط ہے کہ ایمان والا دوسروں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ بد خواہی ایمان کے کمزور ہونے کی علامت ہے۔ بد خواہ اپنے ایمان کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ ایک آدمی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گالی دی لیکن آپؑ نے اسے جواب میں دعا دی۔ آپ نے فرمایا' کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ (ہر برتن سے وہی کچھ نکلتا ہے جو کچھ کہ اس میں ہوتا ہے)۔ جو کچھ اس میں تھا اس نے باہر نکالا اور جو کچھ مجھ میں تھا میں نے وہی باہر نکالا۔ قرآن پاک میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی اور فرمان ہے کہ برائی کو اچھائی سے دور کر دو' برائی کا بدلہ اگر اچھائی سے دیا جائے تو دشمن بھی یار بن جاتا ہے۔

## مقصد کے تعین میں مثبت سوچ کا کردار:

مثبت سوچ رکھنے والا آدمی دنیا میں کچھ کر کے جاتا ہے' ذکر کرنے والا ہمیشہ مثبت سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ آپ بھی دل میں پختہ ارادہ کر لیں کہ دنیا میں کچھ کر کے

مرنا ہے۔ عزم صمیم کرنے کیلئے کوئی مقصد متعین کریں کہ میں نے اس مقام تک پہنچنا ہے۔ مقصد متعین کرلینے سے آدمی کو کام کرنے کا ایک میدان مل جاتا ہے۔ جب تک انسان کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو تو زندگی میں کامیابی مشکل ہے۔ اس طرح تو جیسے دنیا میں آئے تھے ویسے ہی گزر جائیں گے۔ لیکن یاد رکھیں کہ مقصد متعین کرنے کیلئے سوچ کا مثبت ہونا اور مضبوط قوت ارادی بنیادی شرط ہے۔ اگر منفی سوچ کے ذریعے مقصد کا تعین کیا جائے گا تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہو گا۔ مثبت سوچ اور Will Power (قوت ارادی) کے ذریعے ناممکن کام بھی ممکن بن جایا کرتے ہیں۔

## ایک یورپی مصنف کی دلچسپ مثال:

اٹلی کا ایک ڈاکٹر بڑا محنتی آدمی تھا۔ وہ عربی جانتا تھا اور اس نے عرب حکماء کی عربی کتابوں کا ترجمہ اطالوی زبان میں کیا۔ اسے اس کام میں دو سال لگے۔ اس کے بعد وہ بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ کینسر کا مرض ہے اور یہ بھی بتایا کہ زیادہ سے زیادہ دو سال تک یہ زندہ رہے گا۔ دو سال کے بعد اس کی Death (موت) متوقع ہے۔ اب وہ بستر پر آرام کی حالت میں تھا۔ اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش! میں عرب حکماء کی باقی کتابوں کا ترجمہ بھی اپنی اطالوی زبان میں کردوں تاکہ مخلوق کا فائدہ ہو۔ چنانچہ اس نے Decide (فیصلہ) کرلیا کہ ترجمہ کرنا ہے۔ اس نے لائبریری میں سے عرب حکما کی بہت سی کتابیں منگوالیں جو کہ طب و حکمت سے متعلق تھیں۔ جب ان کی Sorting (چھان بین) کی کہ کونسی کتابیں اہم ہیں جن کا ترجمہ ہونا چاہیئے تو وہ کتابیں اس نے الگ کرلیں اور انہیں گنا تو وہ اسی (80) کتابیں تھیں۔ اب وہ ترجمہ کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ حالانکہ وہ بیمار تھا' کینسر کا شدید مریض تھا' اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے موت سر پر منڈلاتی نظر آرہی تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ اس عظیم مہم کیلئے بالکل تیار ہو گیا۔ اس نے ترجمہ کرنا شروع کردیا۔ اسے ہر دن وقت کے کم ہونے کا احساس بھی دامن گیر تھا لیکن وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس نے پورے دو سالوں کے اندر 80 کتابوں کا ترجمہ اطالوی زبان میں مکمل کرلیا۔

آج اس ڈاکٹر کو دنیا کا سب سے بڑا Translator (ترجمان) مانا جاتا ہے۔ اور "Genns book of world record." میں آج بھی اس شخص کا نام لکھا ہوا ہے۔ اسے یہ اعزاز اسلئے ملا کہ اس کے پیچھے "مثبت سوچ" کی قوت کار فرما تھی۔ اس نے سوچا کہ چلے تو جانا ہی ہے تو یہ دو سال کیوں ضائع ہوں' فارغ رہنے سے مصروف رہنا ہی بہتر ہے۔ اور پھر اس کے سامنے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر عرب حکماء کی ان اہم ترین تصانیف کا ترجمہ ہو گیا تو علم کا ایک بیش بہا خزانہ اطالوی زبان میں آجائے گا۔ چنانچہ اس کی جوان ہمتی نے ناممکن کام کو بھی ممکن بنا دیا۔

## موت کی علامات پانے پر ڈاکٹر کی ذمہ داری:

یورپی ممالک میں ڈاکٹر حضرات قریب الموت لوگوں میں یوں وقت کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں Third World (تیسری دنیا) میں Death expected (قریب الموت) مریضوں کو بتاتے ہی نہیں کہ اتنے دنوں میں اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ بلکہ اس سے یہ بات چھپائی جاتی ہے یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ یورپ میں تو بالکل کھلے لفظوں میں بتادیتے ہیں تاکہ مریض ذہنی طور پر اس کیلئے تیار ہو سکے اور جن سے لین دین وغیرہ کرنا ہے وہ کرلے اور گھر والوں کو نصیحت وصیت کر سکے۔ اسی طرح یہاں بھی ڈاکٹروں کو چاہیے کہ بتادیا کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ توبہ کرلے اور اس کی برکت سے ایمان کی حالت میں چلا جائے اس لئے کہ مومن کا عقیدہ ہے کہ یہاں کا مقام عارضی ہے اور ایک دن تو مرنا ہی ہے اس لیے اگر بتا دیا جائے کہ اتنے وقت تک Death ہو جائے گی تو وہ نصیحت وصیت کر سکے گا' لین دین نمٹالے گا اور کچھ اللہ توبہ کر کے راضی برضا ہو کر تیار ہو جائے گا۔ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ اسی لئے حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ مرتے وقت کوئی نیک آدمی پاس ہونا چاہیے تاکہ وہ اسے ذکر و اذکار کی ترغیب دے۔ ویسے بھی عمر جتنی بھی کم ہو حساب کم دینا پڑے گا۔ حدیث پاک میں کہیں نہیں آیا کہ رسول پاک ﷺ نے درازی عمر کیلئے دعا فرمائی ہو۔ یہ دعائیں تو فرمائی ہیں کہ علم میں اضافہ فرما' صحت و عافیت کیلئے دعا مانگی لیکن یہ دعا نہیں مانگی ہوگی کہ عمر طویل ہو۔

شاید ایک آدھ مرتبہ عمر میں برکت کی دعا فرمائی ہو۔

حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کو جب کسی کی موت کی خبر ملتی تو فرماتے' اچھا ہوا چھوٹ گیا۔ یعنی اچھا ہوا جو آزاد ہو گیا۔ کیونکہ دنیا تو مومن کیلئے قید خانہ ہے اور قید خانے سے رہائی ہوتے ہوئے غم نہیں ہوتا بلکہ خوشی ہوتی ہے۔ جو دنیا کی اس جیل سے آزاد ہو کر اپنے اصلی گھر آخرت میں پہنچ گیا وہ رہائی پا گیا۔

## بلند ہمتی.... اللہ کی مدد کا محور!!!:

لیکن اس قید خانہ سے رہائی پانے کیلئے انسان کو بلند ہمتی سے رہنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ بلند ہمتی کو پسند فرماتے ہیں' بلند ہمت انسان کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ بلند ہمت مرد مومن کے ساتھ ہوتے ہیں۔

*God helps those who help themselves.*

(خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں)

جب انسان بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتا ہے تو پھر بدر میں مٹھی بھر جماعت مسلح لشکر جرار کو خاک آلود کر دیا کرتی ہے' سینکڑوں من وزنی دروازہ ایک نیزہ کی نوک سے اکھڑ جایا کرتا ہے' نعرہ تکبیر کی گونج سے قیصر و کسریٰ کے بلند و بالا قلعے زمین بوس ہو جایا کرتے ہیں۔ جب مرد مجاہد اللہ کی مدد کے ساتھ اٹھتا ہے تو دریاؤں اور طوفانی موجوں کو راستہ دینا پڑتا ہے۔ میرے آقا ﷺ کے سپاہیوں کیلئے درندوں کو بھی جنگل خالی کرنا پڑا۔ حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ ایک دبلے پتلے صحابی ہیں۔ ایک جنگ کے موقع پر ایک قلعہ کئی دن سے فتح نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دن اس مرد قلندر کا جذبہ ایمانی جوش میں آتا ہے' اپنا گھوڑا دوڑا کر اکیلے اس قلعہ کے پاس جاتے ہیں اور تین مرتبہ بلند آواز سے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں اللہ اکبر' اللہ اکبر' اللہ اکبر! پورے کا پورا قلعہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ یہ قلبی جمعیت تھی' تعلق باللہ تھا' قوت ایمانی تھی کہ قوی ہیکل اور ناقابل تسخیر قلعہ بھی مجاہد کے نعرہ تکبیر کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ جی ہاں ایسا ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ ہمت' عزم و ارادہ اور محنت بھی ہو۔

## زندگی کی مہلت اور سالکین کی ذمہ داری:

سالک کو چاہیئے کہ وہ پختہ ارادے کے ساتھ کمربستہ ہو جائے۔ اس کا مقصود حقیقی اور محبوب حقیقی سامنے ہے' اگر محبوب سامنے ہو تو پھر جان کی بازی لگا کر بھی اس کے قدموں تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ محبوب کے سامنے ہوتے ہوئے سستی اور دیر کا کیا مطلب؟ یہ مناسب نہیں ہے۔ دنیا کے محبوبوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ عاشق اپنی جان محبوب فانی کے قدموں پر نچھاور کر دیتا ہے تو محبوب حقیقی جو تمام حسن و جمال کا خالق و مالک ہے اس کے ساتھ عشق و محبت کا انداز کیا ہونا چاہیئے۔ زندگی کی تھوڑی سی مہلت کی قدر کرلیں۔ جس طرح کوئی دریا کو تیر کر عبور کر رہا ہو تو کنارے کے قریب آکر وہ ہاتھ پاؤں تیزی سے مارتا ہے اگرچہ وہ تھکا ہوا ہو پھر بھی سوچتا ہے کہ کنارہ تو سامنے ہی ہے۔ اسی طرح سالک کو چاہیئے کہ وہ دریائے زندگی کے کنارے یعنی موت کو سامنے سمجھ کر جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارلے' ذکر و عبادت کرلے اور اپنے محبوب کو راضی کرلے تاکہ موت کے وقت ندا آرہی ہو' يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ اِرْجِعِى اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبَادِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ○ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○